اسلم انصاری کی نظم میں محبت کے دائرے

The Cirles of Love in Aslam Ansari's Poem

دبیر عباس
پی ایچ۔ڈی، اسکالر، شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر خالد ندیم
صدرِ شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Aslam Ansari is a prominent contemporary Urdu poet. Beside a poet, he is also considered an important Iqbal Shanaas, researcher and critic. He has not only shown creative excellence in Urdu but has also written excellent poetry in Persian, English and Saraiki. His poetry rotates around the romantic sentiments, expression of personal and collective truths, lamentaion of modern turmoil, philosophy of the universe and life, defeat of human and moral values in modern time, patriotism and values of the past. The expression of love is found again and again not only in Aslam Ansari's poetry but also in his prose writings. For him, love is the best and highest activity of life after worship. In this article, the cirles and dimension of his love have been found through his poems.

Keywords: Aslam Asnari, poetry, love, patriotism, poems, Quaid-e-Azam, Fatima Jinnah, Ghulam Farid, Ahmed Nadeem Qasmi,

اسلم انصاری کی طبعی اور تہذیبی مناسبت غزل کے ساتھ ہے اور اتفاق یہ ہے کہ اُن کی غزل ہی زیادہ مقبول بھی ہوئی لیکن انھوں نے تخلیقی اظہار کے لیے کئی پیرائے اختیار کیے۔ اُن میں سے ایک نظم ہے۔ اُن کی نظم بھی مقدار و معیار کے حوالے سے غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ اُن کے شعری اثاثے میں غزلوں کی تعداد ایک سو ترپین (153) جب کہ نظموں کی تعداد ایک سو پچیس (125) ہے۔ ان میں چار حمدیہ اور چار نعتیہ نظمیں، ایک قطعہ اور دو شعر شامل ہیں۔ اُن کے شعری مجموعوں کے دیباچے نہ صرف شاعری سے متعلق اُن کے نظریات جاننے کے لیے اہم ہیں بلکہ اُن کی نظموں کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ "خواب و آگہی"، "نقشِ عہدِ وصال کا" اور "شبِ عشق کا ستارہ" کے دیباچوں میں سے شاعری سے متعلق ایک ایک اقتباس دیکھیے:

> شاعری کی رگوں میں منطق، بلاغت ، لغت، گرامر ، ڈراما، خطابت اور لسانیات کا خون ضرور گردش کرتا ہے، لیکن شاعری ان تمام علوم و فنون سے بلند انسانی زبان کی جمالیاتی تشکیل ہے جو بیک وقت خود کلامی بھی ہے، تخاطب بھی اور مکالمہ بھی۔۔۔ جو نغمہ بھی ہے اور ماورائے نغمہ بھی!(1)

> اخلاقیات ہو یا عمرانیات، تاریخ ہو یا منطق۔۔ شاعری ہر علمی صداقت کو اپنے سانچے میں ڈھال کر ہی قبول کرتی ہے۔ شاعری کی بنیادی زبان وہی ہے جسے زبانِ محبت کہا جاتا ہے۔ دنیا کا ہر شاعر بہت حد تک شاعری کو 'زبانِ محبت' کے طور پر ہی اختیار کرتا ہے لیکن اگر انسان اور ہنر کے ساتھ اس کا رشتہ حقیقی اور تعلق سچا ہو تو زبانِ محبت رفتہ رفتہ ایک عہد کی، بلکہ بعض اوقات پوری انسانیت کی زبان بن جاتی ہے۔ (2)

--

> شاعری بنیادی طور پر جمالیاتی تجربہ ہونے کے باوجود شعور ہی کی صورت گری ہے، یہ زبان کا نغمہ ہے لیکن اپنے متعینہ

معنوں کی طرف بھی اشارہ کرتا جاتا ہے، کیونکہ لفظ معنی سے
جدا اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے، البتہ شاعری صرف الفاظ
کے لغوی معنوں ہی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ان میں مسلسل
وسعت پیدا کرتی رہتی ہے، جو شاعری زبان کی وسعتوں کی
دریافت پر قادر نہیں، زیادہ دیر تک قابلِ توجہ نہیں رہتی۔
(3)

درج بالا اقتباسات کے تناظر میں جب ہم اسلم انصاری کی نظم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اسلم انصاری نے زندگی کے خارجی پہلوؤں، حقیقتوں اور کیفیتوں کے بغور مطالعے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے داخلی احساسات کو نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اُن کی نظم زبان کے وسیع مطالعے کی غماز ہے۔ انھوں نے اپنی نظم میں زبان کے اُن فروگذاشتہ معانی کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے جو زبان کا ناگزیر حصہ ہونے کے باوجود ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں۔ مزید بر آں اُن کی نظم ترسیلِ معانی کے وصف کو بدرجہ اتم اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اُن کی نظم کو پڑھ کر کسی جگہ بھی لفظی یا معنوی لحاظ سے اجنبیت یا ناروائی کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں اُن کی نظم داخل و خارج کے ساتھ ساتھ فکر و فن کا بھی خوب صورت امتزاج بن گئی ہے۔ یہی اُن کی انفرادیت ہے کہ وہ ادب کو برائے ادب اور برائے زندگی، دونوں زاویوں سے دیکھتے ہیں۔

" نظم اک لفظ نہیں، ایک تصوّر ہے حقائق پہ محیط "، اسلم انصاری کا یہ مصرع، نظم سے متعلق اُن کے نظریے کی توضیح کرنے کی صلاحیت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اُن کے نزدیک نظم عصرِ حاضر کا سب سے بڑا صیغہء اظہار ہے۔ لیکن عہدِ حاضر کی نظم سے وہ مطمئن نہیں نظر نہیں آتے۔ وہ کہتے ہیں کہ " نظم چند لفظی پیکروں کو الفاظ کی چھوٹی بڑی قطاروں میں کھڑا کر دینے کا نام نہیں اور نہ تنہا امیجری شاعری کے دوسرے اجزا کا بدل بن سکتی ہے۔ نظم کو نظم ہونے کے لیے سب سے پہلے فنی اور معنوی وحدت ہونا چاہیے۔ "(4)

اسلم انصاری کی نظم جہاں فکری لحاظ سے بہت زرخیز ہے، وہیں فنی نقطہ نظر سے بھی ہر حوالے سے مکمل نظر آتی ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فکر کو فن کے ساتھ یوں ملایا ہے کہ یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ فکر نے خود کو فن میں ڈھالا ہے یا فن نے اپنے اندر فکر کو سمویا ہے۔ فکر و فن کا یہ امتزاج ہی اسلم انصاری کی نظم کی بنیادی خوبی ہے۔ نظم کے فنی تقاضے غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے لیے بھی اتنی ہی ریاضت اور مشاقی کی ضرورت ہے، جتنی غزل کے لیے۔ اپنی

نظموں کے متعلق اُن کا اپنا بیان قابلِ توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جہاں تک میری نظموں کا تعلق ہے، میں انہیں اپنی غزل کا تکملہ یا منظوم حاشیہ نہیں سمجھتا۔"(5)

ڈاکٹر جاوید اصغر کے بقول "اسلم کی نظم میں اردو نظم کی روایت کا رچاؤ، جذبہ و فکر، داخلیت پسندی اور خارجی آہنگ نئی شباہت کے ساتھ سامنے آیا ہے، جو ہلکے ہلکے درد اور مٹھاس کا احساس دلاتا ہے"۔(6)۔ اُن کی نظم میں تجربات اور محسوسات کا عکس واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کے یہاں داخلی تجربات جذباتی اور تخلیقی سطح پر منتقل ہو کر ایک متاثر کُن نظم کی صورت میں ڈھلتے ہیں۔ جدید طرزِ احساس سے آشنا ان نظموں میں روایت کی شمولیت کے حوالے سے ڈاکٹر افتخار شفیع کہتے ہیں:

> یوں تو اسلم انصاری کو میرا جی، ن۔م۔راشد، مجید امجد اور اختر الایمان کے سلسلے کا نظم گو کہنا چاہیے لیکن ان کے ہاں دوسری سمت سے بیدل اور اقبال کی فکری کائنات بھی اپنے اثرات دکھاتی نظر آتی ہے۔(7)

اسلم انصاری کی نظم پر میرا جی، ن۔م۔راشد، مجید امجد اور اختر الایمان کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ روایت کے ساتھ جڑے رہنے کی بات اس زاویے سے بھی قابلِ غور ہے کہ اسلم انصاری کی نظموں میں اگرچہ سب سے زیادہ آزاد نظمیں ملتی ہیں اور اُن کی بعض آزاد نظموں کو شہرتِ دوام بھی مل چکی ہے لیکن ایسا نہیں کہ انھوں نے صرف آزاد نظم کو ہی وسیلہء اظہار بنایا ہو بلکہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے انھوں نے نظمِ آزاد کے ساتھ ساتھ پابند اور معریٰ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اُن کی نظموں میں رومانوی طرزِ احساس، ذاتی اور اجتماعی صداقتوں کا بیان، عصری آشوب کا نوحہ، کائنات اور زندگی کا فکر و فلسفہ، عصرِ حاضر میں انسانی و اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کے علاوہ جذبۂ حُب الوطنی اور عہدِ گزشتہ کی اقدار کی باز آفرینی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اُن کی نظمیں ان کے جدید طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہیں۔

محبت کا بیان اسلم انصاری کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ اُن کی نثری تحریروں میں بھی بار بار ملتا ہے۔ محبت اُن کے نزدیک عبادت کے بعد زندگی کی بہترین اور بلند ترین سرگرمی ہے۔ محبت، محب اور محبوب کے درمیان پائی جانے والی اپنائیت کے جذبے کا نام ہے۔ اُن کے نزدیک محبت ایک ایسا طاقت ور ترین جذبہ ہے، جس نے بذاتِ خود ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور جس کی طاقت سے ساری دنیا کو لپیٹ میں لیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ جو کام محبت کر سکتی ہے، کوئی اور طاقت

نہیں کر سکتی۔ اسی تاثیر کی بنا پر علامہ اقبال نے محبت کو "فاتحِ عالم" قرار دیا تھا۔ اسلم انصاری کے نزدیک لفظ شاعری اور محبت ایک دوسرے کا نعم البدل ہیں۔اس حوالے سے اُن کا ایک اقتباس دیکھیے:

> شاعری اور محبت یوں بھی لازم وملزوم نظر آتے ہیں۔ وہ یوں کہ جس شاعری میں محبت کا بیان نہ ہوخواہ وہ خدا یا مرشد کی محبت ہو یا اپنے جیسے کسی انسان کی وہ شاعری خود ادب میں زیادہ اعتبار نہیں پاتی۔ایسی شاعری کے لیے ہمیں کسی وضاحتی اسمِ صفت (Adjective) کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً اخلاقی شاعری، قومی شاعری، فلسفیانہ شاعری وغیرہ۔(8)

چاہنے اور چاہے جانے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔لہٰذا ہر کوئی زندگی میں ایک بار محبت کے تجربے سے ضرور گزرتا ہے۔اس کی آمد اور تعیّن ہم نہیں، فطرت یا قدرت کی پر اسرار قوتیں کیا کرتی ہیں کہ ہمیں کب محبت کرنی ہے اور کس سے ؟اسلم انصاری اپنے ایک کالم 'زندگی اور محبت' میں لکھتے ہیں:

> محبت وہ سفینہ ہے جو اتفاق کی لہروں پر بہتا ہوا کسی دن، کسی لمحے چپکے سے ہمارے ساحلِ دل سے آلگتا ہے اور ہمیں اپنے لمسِ زرّیں (Golden Touch) سے آن کی آن میں کیا سے کیا بنادیتا ہے۔(9)

عمومی طور پر محبت کا تجربہ جوانی میں ہوتا ہے اور اکثر اوقات یہ تجربہ لاحاصلی کا تجربہ بن جاتا ہے۔ اسلم انصاری بھی جوانی میں اس تجربے سے گزر چکے ہیں اور اُن کے یہاں بھی یہ تجربہ ناکام ہی رہا۔بقول وزیر آغا " نظم میں شاعر محبت کو ایک شخصی تجربے کے روپ میں پیش کرتا ہے"(10)۔اسلم انصاری نے خود بھی ایک جگہ پر اسی بات کی طرف اشرہ کرتے ہوئے کہا کہ "سب سے پہلے تو شاعر کو اپنا ترجمان ہونا چاہیے ،یعنی شاعر کو وہ سچائیاں بیان کرنی چاہئیں جن کا شاہد وہ خود ہے۔(11)۔

اسلم نے اپنی نظموں میں محبت کے ناتمام اور ناکام تجربے کی یادوں کو حسرت، درد، کرب اور کسک کی شکل میں پیش کیا ہے۔اُن کی نظموں میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو مکمل طور پر حسن و محبت اور اس کی مختلف کیفیات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ایسی نظمیں اُن کے پہلے شعری مجموعے "خواب و آگہی" میں نسبتاً زیادہ ہیں۔اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ نظمیں ایک جوان شاعر کی

محبت میں ناکامی کے فوراًبعد لکھی جانے والی نظمیں ہیں کہ جب ناکامی کا زخم تازہ ہے۔اس تجربے سے حاصل ہونے والی لاحاصلی ایسی نظموں کا موضوع بن جاتی ہے۔"خواب و آگہی" میں موجود حسن و محبت کے موضوع پر مبنی نظموں کی فہرست یہ ہے۔"رائیگاں"، "اے صبا اے نامہ بر"، "ربطِ خاطر نہ بڑھا"، "خود را نصیحت"، "میں جانتا تھا"، "تم کبھی ان دریچوں سے جھانکو"، "ملاحت کا بس ایک پرتو سا ہے"، "تو خنداں ہے تو گریاں ہے"، "صبح سے پہلے ایک خواہش"، "ایک نظم"، "چہرے پر بہار کے اجالے"، "ناتمام"، "شامِ ہجراں میں کہاں شوکتِ ہستی کا خیال"، "محبت کے بیاں کرنے کو عمریں چاہئیں جاناں"، "مجھے اپنے لفظوں کی خوشبو میں رکھنا"، خوابِ گُل"، "برسوں پہلے کی اک خواہش"۔اُن کے دوسرے مجموعے "شبِ عشق کا ستارہ" میں ایسی نظموں کی تعداد "خواب و آگہی" کے مقابلے میں آدھی سے بھی کم ہو جاتی ہے اور اُن نظموں میں بھی حُسن کی وہ صورتِ حال نہیں ملتی جو "خواب و آگہی" کی نظموں میں ملتی ہے۔اس کی وجہ عبدالرؤف یہ بیان کرتے ہیں:

> "خواب و آگہی" کی طرح اسلم انصاری "نقش عہدِ وصال کا" میں بھی حسن و عشق کے حوالے سے نہایت خوب صورت نظمیں تشکیل دیتے ہیں۔ان نظموں میں عاشق و معشوق کے جذبات و کیفیات اور ہجر و وصال کے سارے رنگ ملتے ہیں تاہم اس مجموعے میں منظومات کے اندر حسن کی مصوری پر "خواب و آگہی" کے مقابلے میں کم توجہ اور رجحان نظر آتا ہے جو شاید وقت کے تسلسل اور عمر کی پختگی کا اثر ہے۔(12)

تیسرے مجموعے "شبِ عشق کا ستارہ" میں حسن و محبت کے موضوع کو قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہر حال ایسا بھی نہیں کہ اس مجموعے میں روایتی حسن و محبت کے موضوع کو بالکل ہی نہ بیان کیا گیا ہو۔چند ایک ایسی نظمیں ضرور ملتی ہیں کہ جن میں اس موضوع کو جزوی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایسی نظموں میں "تجدیدِ تمنا"، "اے تمنا کی سلگتی ہوئی شام"، "شبِ عشق کا ستارہ"، "یہ ناممکن نہیں تھا" اور "شام" قابلِ ذکر ہیں۔

اسلم انصاری کے نزدیک محبت ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ایک نور ہے، آفاق پر چھائی ہوئی ایک خوشبو ہے اور آسمان اور ماورائے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک صداقت ہے۔اس مختصر سی زندگی میں اس کی تفسیر لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی، اس کے لیے عُمریں درکار ہیں۔

محبت کے بیاں کرنے کو عُمریں چاہئیں جاناں

فقط یہ زندگی کیا ہے "۔۔۔!

(خواب و آگہی۔ ص164)

لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے وہ لفظوں کے حقیقی جوہر اور جادوئی قوّت کو سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس جذبے کے پہلوؤں اور کیفیات کا ذکر انتہائی پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں۔ حسن و محبت کے موضوع پر لکھی گئی اُن کی نظمیں اپنا ایک تاثر رکھتی ہیں۔ حُسن محبت کا مرکز ہے۔ اسلم انصاری نے اپنی فطری جدت پسندی اور انفرادیت کے احساس کے زیرِ اثر شاعری کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دوسرے موضوعات کی طرح تصوّرِ حسن و عشق میں بھی تازگی، جدت اور انفرادیت نظر آتی ہے۔ اسلم انصاری حُسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملاتے بلکہ حقیقت پسندگی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ دو نظموں میں سے اقتباس دیکھیے:

رنگت نہ گلابی، نہ سنہری، نہ شہابی
اک سبز سی کاہش غمِ پنہاں سے فروزاں
آنکھوں میں نہ اظہار، نہ پہچان، نہ نفرت
اِک سوچتی حیرت
قامت کوئی شمشاد نہ صورت کوئی فتنہ
موزونیِ پیکر کی بس اک شوخ تمازت۔۔!
(خواب و آگہی۔ ص56)

سنہری، زرد رنگت (لفظ کم ہیں)
اور آنکھوں میں حیاتِ محض کی تنویر،
مرمر میں لہکتے شاخساروں کی لچک
لہجے میں صَوتِ بے تعین کی چمک
اور دست و بازو میں چھکتے بولتے
خُونِ جواں کی گرم رفتاری۔۔۔
لباسِ خُوش تراشیدہ میں حُسنِ لازماں
(خواب و آگہی۔ ص142)

"چہرے پہ بہار کے اُجالے" میں اسلم انصاری نے بظاہر تصویر بناتی ایک حسین مصوّرہ کی قصیدہ خوانی کی ہے لیکن نظم کے کچھ مصرعے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس نظم کی تخلیق محض ایک منظر کی بنیاد پر ہی نہیں ہوئی بلکہ اس میں کچھ اور عوامل بھی کار فرما ہیں۔ چہرہ، ماتھا، کان، بال، آنکھیں، ہونٹ اور پیراہن کا ذکر جہاں قاری کی آنکھوں کو مصوّرہ کے حسین پیکر کی لطافت سے مالا مال کرتا ہے وہیں اس بات کا قائل بھی کرتا ہے کہ شاعر نے مصورہ کو تصویر بناتے دیکھا ہو گا۔ لیکن سانسوں میں گلابوں کی سی تازگی، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شاعر نے مصوّرہ کو محض تصویر بناتے ہی نہیں دیکھا بلکہ اُسے اُس کی کی قربت بھی نصیب ہوئی ہے۔ بے مثال حُسن کی پیکر تراشی میں تشبیہات کا خوب صورت استعمال دیکھیے:

چہرے پہ بہار کے اجالے
ماتھے پہ شباب کا سویرا
کانوں میں لَووں کے نُور پارے
بالوں میں عدم کا گُھپ اندھیرا
آنکھوں میں اُمنگ روشنی کی
ہونٹوں پہ غرور کے قرینے
سانسوں میں گُلاب تازگی کے
(خواب و آگہی۔ ص146)

حُسن کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر عاشق کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہیں اور حُسن نظر نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر جس چہرے پر فدا ہے، اُسے اس نے پہلی بار اور اتفاق سے کسی گل پوش دریچے سے جھانکتے یا پھر کسی مرمریں، پُرپیچ زینے سے اترتے دیکھا ہے کہ جہاں بھی محبوب کا ذکر ہوا ہے اسلم انصاری نے دریچے یا زینے کا ذکر ضرور کیا ہے۔ مختلف نظموں سے چند مثالیں دیکھیے:

لرزاں ہے مرے آئینۂ دل میں ابھی تک
وہ زینۂ پیچاں سے اترتی ہوئی حیرت زدہ صورت
(خواب و آگہی۔ ص57)

پھر اسی راہ سے گزریں تو نئے رنگ سے دیکھیں اس کو،
ایک رنگین دریچے کے قریں، روپ کا رس چھلکاتے
ایک زینے سے اتر کر کسی صحنِ سمن اندوز کی جانب جاتے
(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص46

کبھی تم سے سوچا تو ہو گا تمہارے دریچوں سے باہر۔۔۔دریچوں
کے نیچے
تراشیدہ زینوں پہ سر رکھ کے روتے ہوئے شاخساروں میں
وہ دل بھی ہے۔۔۔ جس کی تنویر تم ہو۔۔۔۔؟!
(خواب و آگہی۔ ص90)

اے صبا، اے نامہ بر
وہ گُل بدن
وہ گل بدن کس دریچے سے ہے ہم آوار گاں پہ خندہ زن
(خواب و آگہی۔ ص81)

نظم "تُم کبھی اِن دریچوں سے جھانکو" بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ شاعر کو محبوب کا اوّلین دیدار ایسی ہی کسی صورت میں نصیب ہوا۔

تم کبھی اِن دریچوں سے جھانکو کہ جن پر
جُھکے شاخچوں نے بہاروں کی گُل ریز تعبیر لکھی ہے
اُن کہکشاؤں نے تنویر لکھی ہے
جن کی دمک میں تمہارے مقدّر کا حصّہ بھی ہے

۔۔۔اِن دریچوں سے جھانکو
تو دیکھو کئی دل گرفتہ شگوفے
تمہاری سبک آہٹوں کو ترستے ہوئے مر رہے ہیں،۔۔۔
(خواب و آگہی۔ص97)

اگرچہ اسلم کے محبوب میں جسمِ جواں کی تابناکی کے ساتھ ساتھ اجداد کی ثروت کی وجہ سے غرور اور نخوت کا پہلو بھی موجود ہے لیکن وہ اسلم سے بے نیازی اور تغافل کسی صورت نہیں برتتا۔ وہ اُس سے محبت بھی کرتا ہے اور کسی حد تک وفا بھی۔ کیوں کہ اُسے یقین ہے کہ اسلم اور وہ مل کر وہ لمحے تخلیق کریں گے جن کی چھاؤں میں سُرخ پھولوں کی طرح سویریں جاگتی ہیں۔اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلم کے یہاں محبت یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہے۔اس دو طرفہ محبت میں زمانہ لاکھ اپنی فطرت کے مطابق آڑے آتا ہے اور طرح طرح کی بد گمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ زمانے کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اسلم کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

روکنے والے تمہیں ہر موڑ پر کہتے رہے:
"یہ وفانا آشنا ہے، ساتھ کب دے گا تمہارا سوچ لو"!
تم نے اِن باتوں کو سچ جانا، مگر پھر بھی
وفا کے عہد کی پرچھائیوں میں چل پڑیں
مختصر رختِ سفر کے ساتھ اَن جانی منازل کی طرف!
(خواب و آگہی۔ص158)

اچانک وہی محبوب اُلٹے رُخ پھر جاتا ہے اور اسلم کا دامن دُکھوں کے سنگریزوں سے بھر دیتا ہے۔یوں اسلم کو ناتمامی کا زہر پینا پڑتا ہے۔ابتدا ہی میں محبوب کے رویّے سے اسلم کو اندازہ تھا کہ یہ حُسن آفرینیاں درحقیقت فریب کاریاں ہیں۔ نظم "میں جانتا تھا" میں اسلم انصاری محبوب کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ایسا ہونا میری توقع کے عین مطابق ہے کیوں کہ میں یہ سب جانتا تھا:

میں جانتا تھا کہ خُود نگر ہیں
اداسیوں کا فریب دیتی ہوئی وہ آنکھیں
میں جانتا تھا کہ اُن گھنے ابروؤں میں

نخوت کی ایک گہری لکیر بھی ہے
میں جانتا تھا کہ مرمریں بازوؤں میں مجھ کو
حیاتِ تازہ کے جو ہیولے دکھائی دیتے ہیں
میری اپنی ہی خواہشوں کے حسیں بھنور ہیں
میں جانتا تھا کہ آخر الامر ڈوبنا ناگزیر ہو گا
مجھے خبر تھی کہ اُس کے ہونٹوں کا ساحرانہ سکوت
میرے تمام الفاظ چھین لے گا۔۔۔میں جانتا تھا

(خواب و آگہی۔ ص96)

محبوب سے ملاپ کی خواہش عاشق کو ہر وقت تڑپاتی ہے۔ بعض اوقات یہ خواہش تکمیل پذیر بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن محبت کی اُس کہانی میں جو ہماری شعری روایت کا حصہ ہے، اِس ملاپ کا دورانیہ انتہائی مختصر ہے۔ اسلم کو بھی جہاں سوز اور دل افروز حُسنِ خود آرا کے لمس کی خواہش بہت حزیں رکھتی ہے اور یہ خواہش بالآخر بادام کی ایک شاخِ ثمر دار کے سائے میں گھڑی بھر کی رفاقت میں پوری تو ہو جاتی ہے لیکن اسلم کے ہاں ملاپ کا یہ سیّال لمحہ بھی دُکھ میں بدل جاتا ہے کہ اب اُسے اِس لمحے کی پاداش میں اکیلے پن کا طویل اور کٹھن سفر رہتی زندگی تک کے لیے اختیار کرنا ہے۔

برسوں پہلے کی اس خواہش کو تم نے پُورا تو کیا
لیکن چند قدم،۔۔۔اور چند ادھوری باتیں،۔۔۔
اس کے بعد زمانوں اور جہانوں کی لاحاصل دُوری

(خواب و آگہی۔ ص190)

محبت کے لطیف جذبے سے بھرپور ایک نظم "مجھے اپنے لفظوں کی خوشبو میں رکھنا" ہے۔ جس میں شاعر دل کے ہاتھوں بے بس ہو کر بچھڑنے والے سے نہایت عاجزی اور دردمندی کے ساتھ التماس کرتا ہے کہ مجھے اور میری کچھ باتوں کو بھول نہ جانا۔ اُن باتوں میں کس قدر صداقت، پاکیزگی، نزاکت اور جذبے کی شدت ہے، ملاحظہ کیجیے:

مرے چند خط ہیں، جنہیں میں نے اپنے لہو کی صداقت سے لکھا
تھا تم کو
مرے چند لمحے ہیں، جن میں صداؤں کی پاکیزگی سے پکارا تھا تم کو

مرے چند لہجے ہیں، جن میں تُمہارے ہی طرزِ تخاطب کا رنگ آ چلا تھا
مرے چند جُملے ہیں، جن کو سماعت کیے اب تمھیں ایک مدت ہوئی ہے
مری کچھ پسندیدہ باتیں ہیں، جن کو میسّر تمہاری پسندیدگی تھی
مری کچھ کتابیں ہیں جو تم نے شاید یونہی مانگ لی تھیں،۔۔۔۔۔
مرا ایک ماضی ہے جس کو تمہاری رفاقت نے ماضی کا مفہوم بخشا
(خواب و آگہی۔ ص(175)

دلچسپ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسلم انصاری محبوب کو اپنی چیزوں اور باتوں کے سنبھالے رکھنے کی گزارش تو کر رہے ہیں لیکن خود نیلے ورق کی سلوٹوں میں عجلت سے لکھے ہوئے چند الفاظ پر مبنی ایک "Love Letter" بھی گم کر بیٹھتے ہیں جو اُن کی زندگی کا اثاثہ ہے۔

اب چشم و نگاہ کس کو ڈھونڈیں
وہ خط بھی نہیں ہے بہرِ تسکیں
نقطہ بھی ملے گر اُس قلم کا
ہم اُس کو بنائیں شہرِ تسکیں
(نقش عہدِ وصال کا۔ص119)

مختصر سے ملاپ کے بعد جدائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے سے متعلق ڈاکٹر جاوید اصغر کہتے ہیں:

> بچھڑنا اسلم کے ہاں قرین قیاس، قابلِ فہم اور زندگی کی حقیقت ہے۔ اس لیے نہ صرف اِس میں جدت اور بانکپن ہے بلکہ غم زدہ کرنے کی یہ کیفیت رومانوی ہو گئی ہے۔(13)

نظم "شامِ ہجراں میں کہاں شوکتِ ہستی کا خیال"، "اے تمنا کی سلگتی ہوئی شام"، اور "شام" میں اسلم انصاری بڑے شد و مد کے ساتھ جدائی کے کرب میں مبتلا محبوب کی یاد میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ "شام" میں یاد کے آنے کا انداز دیکھیے:

شام آئی
تو کوئی یاد بھی چپکے سے چلی آئی ہے
راہ جیسے کوئی انجان حسینہ بھولے
جیسے نغمہ کوئی احساس کے لَے کو چھولے

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص183)

فیض کے ہاں بھی محبوب کی یاد کی آمد کچھ ایسے ہی انداز میں ہوتی ہے:

رات یوں دل میں
تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں
چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں
ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے
وجہ قرار آ جائے

(فیض)

لیکن جلد ہی یاد کی اس شدت سے نکل کو وہ محبوب کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ نظم "ربطِ خاطر نہ بڑھا" خود کو اسی بات کی تلقین کرتے ہیں کہ آج جو آنکھیں حُسنِ تمنا کے صلے میں شرابور ہیں، کل انھی آنکھوں میں بے مہری اور بے وفائی کے ڈورے ہوں گے۔ آج جن ہونٹوں پر سخن آگیں سکوت کے گلاب کھل رہے ہیں، کل یہی ہونٹ زمانے کے بدلتے ہوئے تیور ہوں گے اور آج جن ہاتھوں کا اِک نرم لمس رُوح میں سوئے ہوئے نغموں کو جگاتا ہے، کل تُم پہ برسانے کے لیے انہی ہاتھوں نے پتھر اُٹھا رکھے ہوں گے۔ وہ محبوب کے لیے شاخ اور اپنے لیے پتے کی علامت استعمال کرتے ہیں کہ 'شاخ بے مہر ہے، پتوں کو گرا دیتی ہے'۔ یعنی جس طرح شاخ اور پتے کا تعلق زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا، اسی طرح اُن کا بھی تعلق قائم نہیں رہ سکے گا۔ لہٰذا ربطِ خاطر کی خاطر بے سود کوشش میں وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح نظم "خود را نصیحت" میں بھی خود کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُس کے طرزِ کرم کو بھول جاؤ جس نے تمھیں گھر سے نکالا اور خود سے محجوب ہونا سکھایا۔ یوں جانو کہ وہ پیمان وقت کا حادثہ تھا اور وہ شخص بھولنے کی خاطر ہی روانہ ہوا تھا۔ یہ جدائی اٹل تھی اور اسے ہو کر رہنا تھا۔ لہٰذا اب اُسے بھول جانے میں ہی بہتری ہے:

پسِ در اگر کوئی آہٹ نہیں ہے، تو بہتر یہی ہے

کہیں بھی کوئی کھکھلاہٹ نہیں ہے، تو بہتر یہی ہے
اگر قریۂ خوف کی شاہراہوں پر اُس کی رفاقت میسر نہیں ہے، تو
بہتر یہی ہے،
(خواب و آگہی۔ ص94)

اسلم انصاری نے محبت کے اس ناتمام تجربے کو اپنی نظم "ناتمام" میں قلبی احساس کی گہرائیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شوق کے پُر پیچ رستوں پر چلتے ہوئے شکستِ جاں کے کئی عبور کرنے کے بعد اُن کے یہاں ایک احساسِ رائیگانی ابھرتا ہے اور ایک ایسا راز کُھلتا ہے، جو ان کے دل میں کسک بن کر رہ جاتا ہے۔

کُھلا کہ بھول ہوئی شدتِ تمنا میں
چراغِ جاں کو کسی اور طرح جلنا تھا
رفیقِ راہ کو قاتل سمجھ کے چلنا تھا (خواب و آگہی۔ ص161)

اسی طرح ایک نظم "ایک خیال" میں خود کلامی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی آنکھوں میں حرمتِ انساں کا شعور نہ تھا، جن کے ہونٹوں پہ حرفِ ملائم کی لکیر نہ تھی، جن کے لہجے سے بے مہر غرور جھلکتا تھا، جن کے دروازوں پر عدل کی بے بس زنجیر لٹکتی تھی، جن کے سینوں میں نفرت ہی نفرت بھری تھی، ایسے لوگوں کے لیے کمربستہ رہنے کا کیا فائدہ ہوا؟ رائیگانیِ وقت پہ پچھتاتے ہوئے کہتے ہیں "اِس سے بہتر تھا کہ تُم صرفِ ہُنر ہو جاتے"۔(14)۔ اب اُن کے لیے آوارہ گردی اور درس و تدریس ہی مایہ صد عیش و راحت ہے۔

اب قریۂ اجداد میں آوارہ خرامی
تدریس کے اُلجھاؤ میں بے نام سی لذّت
موزونیِ پیکر کی کوئی شوخ شرارت
دیکھوں تو خیال آتا ہے کہ اس معبدِ غم میں
اک عمر کی بے سود عبادت کی سزا
۔۔۔۔۔۔ہے اور عبادت۔۔۔۔۔!!(خواب و آگہی۔ ص58)

موزونیِ پیکر کی کوئی شوخ شرارت دیکھ کر انھیں بھی اپنی جوانی اور محبت کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ محبت کے دنوں کی یاد کی کیفیت میں لکھی گئی نظموں میں "محبت کے دنوں کی یاد میں لکھی

گئی ایک نظم"، "معذرت"، "درسِ جمال"، "یہ جو خواب خواب ہیں رتجگے" اور "موسمِ گُل سے ذرا پہلے کی شام" اہم ہیں۔ یہ نظمیں ماضی اور محبت کے دنوں کی یاد آفرینی کا عمدہ شعری اظہار ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے محسوسات کا ایک نیا رنگ پیش کیا ہے۔ "محبت کے دنوں کی یاد میں لکھی گئی ایک نظم" میں وہ کہتے ہیں کہ میں ہی تمہیں نہ سمجھ سکا اور تمہیں نامہرباں، سنگدل، مغرور اور بے مہریِ ایّام کا پیکر سمجھتا رہا جب کہ تم اپنی روح کی گہرائیوں میں بہت خوب صورت تھیں اور بہت مہرباں تھیں۔ "معذرت" میں بھی احساس کا ایک نیا زاویہ ہے کہ شاعر یہ کہہ کر کہ 'نہ ہم نے ہی عرضِ حال کیا' محبوب کو بے قصو ٹھہرا دیتا ہے۔ "درس جمال" میں جہاں حسن کی جزئیات کو پیش کیا گیا ہے اور شاعر اس نظم میں بھی محبوب کو مہرباں ہی سمجھتا ہے اور محبوب کی قربت کے لمحے کو شعورِ ذات کو کشف کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

وہ شعلۂ جمال جو دھڑکا تو دفعتاً
ہر سمت اِک فروغِ جمالِ حیات تھا
اُس چشمِ نیم وا نے کیا مجھ پہ منکشف
میں ہی حریفِ سلسلۂ حادثات تھا
اُس زلفَ خم بہ خم نے دیا مجھ کو یہ ثبوت
میرا خیال رابطۂ ممکنات تھا
اُس دستِ مہرباں کا گریزاں سا ایک لمس
بتلا گیا وہ راز کہ سِرِّ ثبات تھا
اب سوچتا ہوں کہ وہ اُک حرفِ التفات
میرے لیے تو کاشفِ اسرارِ ذات تھا
(نقش عہدِ وصال کا۔ ص 153)

"محبت کی ایک نظم" اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے کہ اس نظم میں محبت کو آفاقی قدر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جیسے حفیظ ہوشیار پوری کا شعر ہے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے
(حفیظ ہوشیار پوری)

ایسے ہی اسلم انصاری بھی اس نظم میں کہتے ہیں کہ محبت کی خاطر انسان دنیا کے تمام رنج و غم سہہ لیتا ہے۔ عدل گاہوں کی نا انصافیاں، آئے روز بڑھتی الجھنیں اور واہمے، بے مہریاں اور فریب کاریاں، بے یقینی کی صورتِ حال اور شکستِ آرزو کو برداشت کرنے کا حوصلہ محبت ہی بخشتی ہے۔ "یہ جو خواب خواب ہیں رتجگے" میں بھی شاعر کی سوچ کا زاویہ بدلا ہوا ہے کہ وہ محبوب کی جدائی میں پیدا ہونے والی ہر کیفیت کو مثبت انداز میں لیتا ہے۔

یہ جو خواب خواب ہیں رتجگے،
تری یاد ہیں
یہ جو اشک اشک ہیں
زمزمے، ترے بعد ہیں
یہ جو بے کلی سی ہے دل میں
ذوقِ حیات ہے
یہ جو درد سا ہے جگر میں، رنجِ
نشاط ہے
اس نظم کا اختتام رجائیت
بھرے اس شعر پر ہوتا ہے:
یہ بجھی بجھی سی جو شام سینہ
فگار ہے
یہی غم زدوں کے لیے عروسِ
بہار ہے

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص84)

"موسمِ گُل سے ذرا پہلے کی شام" اگرچہ بلا واسطہ تو نہیں مگر بالواسطہ طور پر محبوب کی یاد میں ہی لکھی گئی ایک نظم ہے۔ وہ اس طرح کہ نظم اُس نظم کی یاد میں لکھی گئی، جو کبھی محبت کے دنوں میں اسلم انصاری نے گورنمنٹ کالج، لاہور کے ایک کُنجِ گُل میں اپنے محبوب کی یاد میں لکھی

تھی۔ اِس نظم میں اسلم انصاری، اُس نظم کے وقت اور مقامِ تخلیق کو یاد کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

موسمِ گُل سے ذرا پہلے کی وہ شام، خنک اور حزیں
روشنی جس کے دھندلکوں میں بہت دیر رہی محوِ خرام
میں اُسی رہگزرِ منزلِ ہستی کے قریں
سروِ کم قامت و اشجارِ نمو خیز سے تھا وقفِ کلام
مجھے اِک پیکرِ رعنائی کی یادوں نے کیا تھا بے کل
جس کی قربت میں گزارے ہوئے گنتی کے دو پل
وقت کی موج میں گھل مل کے مرے ساتھ چلے آئے تھے
(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص138)

اس کے بعد شاعر اِس نظم میں اُن خوابوں کے بارے میں بتاتا ہے جو اُس وقت اُس نے جاگتی آنکھوں سے تراشے اور پھر تحریر کیے۔ پھر حرفِ تمنا کو منظوم کیا اور محبوب کی آنکھوں کی چمک، اُس کے لرزتے ہوئے بُندوں کی دمک اور اُس کے ملبوس پہ بکھرے ہوئے پھولوں کی مہک کے دلکش بیان کے ساتھ اُس پیکرِ صد ناز کو تجسیم کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ اب بھی جب مجھے اُس کنجِ گلُ کی یاد آتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا سوچوں بھرا خواب وہیں ٹھہرا ہو گا۔

اب بھی جب یاد کروں رہگزر، گُل کے قریں
سروِ کم قامت و اشجار کے سائے میں گُلاب
ایسا لگتا ہے وہیں ٹھہرا ہوا ہو گا۔ وہ سوچوں بھرا خواب!
(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص139)

جیسے جیسے اسلم انصاری زندگی اور نظم کا سفر طے کرتے جا رہے ہیں ایسے ایسے اُن کی شاعری میں حسن و محبت کا موضوع ماند پڑتا جا رہا ہے۔ آخری شعری مجموعے "شبِ عشق کا ستارہ" کی نظموں میں جذبۂ محبت میں وہ شدت نہیں جسے ہم "خواب و آگہی" کی نظموں میں محسوس کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا نظم بھی ہم نے دیکھا کہ محبوب کی یاد میں نہیں بلکہ ایک نظم کی یاد میں لکھی گئی۔ ایسے ہی اس مجموعے میں ایک نظم کا موضوع اگرچہ "تجدیدِ تمنا" ہے لیکن دیکھیے تو یہ تمنا دیدار، اظہار، اقرار، وصل حتّٰی کہ کسی گلے یا شکوے کی تمنا بھی نہیں بلکہ ایسی تمناؤں کا بالکل مخالف زاویہ

ہے۔شاعر چاہتا ہے کہ کاش تاریخ ایک بار اپنے آپ کو دہرائے اور وہ لمحہ واپس آئے جس لمحے پہلی بار اس نے محبوب کو دیکھا تھا اور اُس پر قربان ہو گیا تھا۔ اگر وہ لمحہ واپس آ جاتا ہے تو شاعر کیا چاہتا ہے، ذرا دیکھیے۔

اب کے اس طرح سے اُس راہ گزر سے گزریں
جیسے اُس سے تو کوئی ہم کو سروکار نہیں
ذوقِ دیدار نہیں، خواہشِ اظہار نہیں
(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص47)

اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ اُن کی شاعری سے یہ پہلو محو ہو گیا ہو بلکہ یوں لگتا ہے کہ محبت کا یہ جذبہ ایک اور زاویے سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔یہ زاویہ 'جذبۂ حُب الوطنی' کا زاویہ ہے۔اس مجموعے میں شامل محبت کے اس زاویے سے سرشار نظمیں زیادہ ملتی ہیں۔اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں تک آتے آتے اُن کی محبت کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔پہلے مجموعے "خواب و آ گہی" میں بھی ایسی نظمیں موجود ہیں، جو خالصتاً جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر لکھی گئیں۔ایسی ایک نظم "ہوا نرم رو ہے" وطنِ عزیز کے لیے دعائیہ ایک نظم ہے۔شاعر وطن کو یوں دعا دیتا ہے۔

اے وطن، تُو سلامت رہے، تیری صبحیں سلامت رہیں
تیرے ماتھے پہ اُجلے اجالے کی کرنیں سلامت رہیں
تیرے چشمے رہیں، تیرے جھرنے رہیں، تیرے دریاؤں میں یہ روانی رہے
تیرے بچے رہیں، تیرے بچوں کے دل میں سدا جراتِ پاسبانی رہے
(خواب و آ گہی۔ ص129)

اور اس سے ہی اگلی نظم میں اپنے وطن کی نژادِ نو کے لیے یوں دعا گو ہے۔

اے خدائے جہاں، اے خدائے جہاں
یہ زمیں آسماں یُونہی قائم رہیں
تیری قدرت کے اسرار دائم رہیں
اِن کو توفیق دے، اِن کے ہاتھوں سے ایک ایسے آئندہ کی آج تعمیر ہو
جس میں آدم کے عظمت کے ہر خواب کی ایک تعبیر ہو
(خواب و آ گہی۔ ص130)

اسی مجموعے کی ایک اور نظم "سلامِ شوق" میں شاعر اپنے عہد کے تخلیق کاروں، درختوں کی ناکارہ شاخوں اور سوکھے پتوں کو چنتی ہوئی محنتی لڑکیوں، سر پر گھاس اور بُھوسے کی گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے شہر کی سمت سے آتے ہوئے راہیوں، سرحد کی حفاظت پر مامور پاسبانوں، دُور افتادہ قصبوں میں تعلیم دینے والے معلموں، پہاڑوں میں دن رات کام کرنے والے مزدوروں، ساربانوں، کسانوں، گڈریوں اور وطنِ عزیز میں جانفشانی کے ساتھ فرض نبھانے والے ہر شہری کو قلب وذہن اور حرف و قلم کا سلام پیش کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک اور نظم "خلاّقینِ جمال" ہے۔ یہ نظم حدیث پاک "الکاسب حبیب اللہ" کی تشریح وتوضیح ہے۔ محنت کش کا ہاتھ "دستِ تسخیر بھی ہے اور دستِ تقدیر بھی" اور اس ہاتھ میں زندگی، روشنی اور خودگری کی ادا پائی جاتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلسل کوشش اور تگ و دو کو اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ پست ہمتی اور بے صبری کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں سے دنیا مہذب ہوئی انسانیت کی جبین روشن ہوئی۔ علم و ہُنر اور شعورِ ذات کی پَو پُھوٹی اور زندگی کو زندگی کے معانی سے آشنائی ہوئی۔ اسلم انصاری ان محنت کش لوگوں کو "خلاقینِ جمال" قرار دیتے ہوئے، درحقیقت اپنے محنت پسند طبقے کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کی ایک اور نظم "میرے مشرق، مِری خواہشوں کی زمیں" میں بھی مشرقیت اور مشرق سے محبت کا ایک ٹھاٹیں مارتا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر افتخار شفیع لکھتے ہیں:

> "مشرق" ان کے لیے ایک خاص روحانیت سے معمور زندگی کا استعارہ ہے اور علومِ مشرق ایسے سورج کے مانند ہیں جو 'مشرق' سے طلوع ہوتا ہے اور دعوتِ نظارہ دیتا ہے(15)

بہر طور پہلے شعری مجموعے کی اشاعت کے بعد تو یوں لگتا ہے کہ جیسے مشرق اور خصوصیت کے ساتھ وطنِ عزیز سے محبت کا جذبہ اُن کے اندر گھر کر گیا ہو۔ وہ اس کا اظہار بھی جگہ جگہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ 1983ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے ایسی ہی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

> آج کے باشعور نقادوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ ایک نئی قومی (پاکستانی) شاعری کے خدوخال متعین کرنے کا کام کا آغاز کریں جس میں ہمارے لیے ایک نئے فرد کا رویا بھی ہو اور زمیں کے رنگ وبو کی ایک بھرپور تصویر بھی۔(16)

دوسرے مجموعے "نقش عہدِ وصال کا" کی آخری تینوں نظمیں اس خواہش کی عکاس نظر آتی ہیں۔ تینوں نظمیں تاریخِ پاکستان میں اہم ترین دنوں اور واقعات سے متعلق ہیں۔ مزید خوب صورتی یہ ہے کہ مجموعے میں ان تینوں نظموں کو زمانی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ نظمیں یہ ہیں:

1۔ بختِ بیدار نے کیا خواب انوکھا لکھا

2۔ طلوعِ سحر

3۔ سلام تم پر، سلام تم پر

متذکرہ بالا پہلی نظم قراردادِ پاکستان سے متعلق ہے۔ قراردادِ پاکستان، جدوجہدِ آزادی کا ایک موڑ ہے۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک میں قائدِ اعظمؒ کے زیرِ صدارت ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس یہ قرارداد مولوی اے کے فضلِ حق نے پیش کی اور چودھری خلیق الزمان نے اس کی تائید کی۔ دیگر عمائدین نے اس قرارداد کی حمایت کی۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کی اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک الگ ریاست قائم کی جائے۔ اُس وقت دشمنانِ پاکستان کو، پاکستان کا قیام ایک خواب ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اہلِ نظر اس خواب کو حقیقت میں بدلتا دیکھ رہے تھے۔ اس تاریخی قرارد نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا اور یہ قرارداد حُصولِ پاکستان کے سلسلے میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ قصیدے کی ہئیت میں لکھی گئی گیارہ اشعار پر مبنی اس نظم میں اسلم انصاری نے دراصل ایک قصیدہ ہی لکھا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

دفترِ دہر میں ملتا ہی نہ تھا نام و نشاں
قوم نے اپنے لیے اپنا صحیفہ لکھا
چشمِ اعدا کے لیے اس کی عبارت تھی غبار
اہلِ تدبیر نے دستور کچھ ایسا لکھا
ناخدا اپنا تھا جس نے بہ تائید خدا
عین گرداب میں موجوں کا کنارہ لکھا

(نقش عہدِ وصال کا۔ ص172)

تاریخ گواہ ہے کہ قرارداد کی منظوری کے بعد آزادی کے لیے برِ صغیر میں ایک ایسی لہر اٹھی جس نے گرداب میں پھنسے مسلمانوں کو کنارے سے لگا دیا اور سات سال کے مختصر عرصے میں

انگریز حکمران نہ صرف برِ صغیر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے بلکہ 14 اگست 1947ء کی سحر طلوع ہوئی کہ چشمِ دنیا نے دنیا کے نقشے پر مملکتِ خداداد پاکستان کا خوب صورت نام ابھرتے دیکھا۔ نظم "طلوعِ سحر "اسی صبحِ آزادی کے بارے میں ہے جو بے بنیاد تاریکی کا پردہ چاک کر کے طلوع ہوئی۔ یہ نظم ترکیب بند ہے اور اس کے دو بند ہیں۔ دونوں بند سات سات اشعار پر مبنی ہیں۔ پہلے بند میں شاعر نے قیامِ پاکستان کے لیے کی گئی جد جہد کو بیان کیا ہے جب کہ دوسرے بند میں جدو جہد کے ثمر آور ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ انداز دیکھیے:

زہے نمودِ تجمل، بکھر چکی زنجیر
خوشا کشادِ پر و بال۔۔۔جاچکا صیّاد
نگاہِ ارضِ وطن، اے بہارِ دیدہ و دل
نشاط و وجد میں ہیں تیرے قمری و شمشاد
(نقش عہدِ وصال کا۔ ص174۔175)

چھ ستمبر 1965ء پاکستان کی تاریخ کا ایک اور اہم ترین دن ہے کہ اِس دن بھارتی فوج جنگ کا اعلان کیے بغیر بین الاقوامی سرحد پار کے پاکستان کی حدود میں داخل ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ اسلام کا یہ قلعہ جلد ہی اُن کے قبضے میں ہو گا لیکن پاکستان کی بہادر افواج کے دلیر اور نڈر سپاہیوں نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے وطن کی حرمت کو پامالی سے بچالیا اور دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ راہِ حق کے شہیدوں کو انتہائی والہانہ انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

سلام تم پر، وطن کے حرمت بچانے والو
اُفق کے اُس پار جانے والو
سلام تم پر، سلام تم پر!
(نقش عہدِ وصال کا۔ ص178)

اس نظم میں وطن اور اہلِ وطن سے محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔ نظم کا ہر مصرع جرات و بسالت کے احساسات سے لبریز ہے۔ شاعر شہیدوں کو سلام پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس دیس اور یہاں کے لوگوں کی عظمت اور زندگی کا وقار آپ ہی کے ایثار کے طفیل ہے اور آپ کے لہو کے

سبب ہی یہ خاک معتبر ہے۔ موت تمہارے لیے فنا نہیں بلکہ حیاتِ جاوداں کا دوسرا نام ہے۔ تم اس دیس کے ذرّے ذرّے کے دل میں دھڑکن کی صورت زندہ ہو۔

تیسرے مجموعے "شبِ عشق کا ستارہ" میں بھی ایسی بہت سی نظمیں شامل ہیں کہ جن کا موضوع حب الوطنی ہے۔ صبحِ آزادی کے حوالے سے ایک خوب صورت نظم "مژدہ اے چشم کہ ہے صبحِ تمنّا کا وہ نور" متذکرہ بالا نظم "طلوعِ سحر" کا تکملہ محسوس ہوتی ہے لیکن اس نظم کا اختتام اسلم ایک دعا پر کرتے ہیں:

اے مرے حرفِ دعا، مانگ وطن کی خاطر
ہر بلندی پہ چمکتے ہوئے سب ماہ و نجوم
اس گلستاں کے لیے مانگ بہارِ عاطر
جس کو مرجھا نہ سکے موجۂ انفاسِ سموم!

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص124)

اسی طرح وطنِ عزیز کے لیے دعائیہ انداز میں لکھی گئی نظم "ترے خیال کے پرچم ہوں بادبانوں میں" ایک محب الوطن شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شاعر اہلِ وطن کے لیے شعورِ ذات اور خود آگہی کی دولت کا طالب ہے۔

شعورِ ذات سے روشن ہوں
مسکنوں کے چراغ
خود آگہی سے جلیں تیری
بستیوں کے چراغ

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص61)

یہ شعور و آگہی انھیں قائد اعظم جیسی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ اسلم انصاری کی ایک نظم "ساقی نامہ" ہے، جو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی۔ یہ نظم نہ صرف قائدِ اعظم محمد علی جناح کے شخصی خد و خال اور فکری خصائص کو نمایاں کرتی ہے بلکہ اس نظم میں وہ اسی شعور و آگہی کی بھی دعا کرتے ہیں، جو بانیِ پاکستان کو نصیب تھی۔

بہم چاہئیں عشق اور آگہی

عبارت انہی سے تو ہے زندگی
وہی زندگی جیسے قائد کی تھی

سراسر عمل، سر بسر روشنی

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص89)

قائدِ اعظم کا شمار بجا طور پر ایسے رہنماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے شخصی اوصاف، فکری خصائص اور تاریخی شعور کے حوالے سے اپنے زمانے پر اثر انداز ہوئے اور حالات کا رخ بدلنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ ایک باصلاحیت رہنما تھے اور دشمن بھی اس بات کا اعتراف کرتے تھے۔ اعلیٰ فہم و فراست اور عزم و عمل کی ایک روشن مثال تھے۔ جودتِ فکر اور حسنِ تدبر جیسی خوبیوں کے مالک تھے۔ صداقت اور حسنِ کردار کا تابندہ نقش تھے۔ اُن کا ذہن ایسا رسا، طبع ایسی سلیم اور خطابت ایسی پُر اثر کہ زمانہ اُن کا قائل تھا۔ وہ ایسی بے شمار خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود انگریز انھیں زنداں میں نہ ڈال سکا اور اُن پر ہندو کی مصلحت کا فریب بھی نہ چل سکا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں شخص تھے۔ اسلم انصاری نے اس نظم میں قائدِ اعظم کے درج بالا تمام اوصاف کو نمایاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے مردِ مومن میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اپنے آخری درجے پر قائدِ اعظم میں موجود تھیں۔ لہٰذا وہ انھیں اقبال کا مردِ مومن نہیں، بلکہ مردِ مومن کی شان قرار دیتے ہیں۔

وہ اقبال کے مردِ مومن کی شان
صداقت کا لہجہ، خرد کی اُٹھان
خرد پرور و عشق عالی مقام
وفا کرتی ہے اُس کو جھک کر سلام

(شبِ عشق کا ستارہ ص۔82)

ایسی ہی ایک نظم "شخص و عکس" ہے۔ اس نظم میں قائدِ اعظم کی تعریف کے ساتھ ساتھ مادرِ ملت فاطمہ جناح تعریف و توصیف کی گئی ہے اور انھیں اپنے بھائی کا عکس قرار دیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جیسے چاند کی معیت میں ایک پُر نور ستارہ ہوتا ہے، ایسے ہی قائدِ اعظم کے ساتھ فاطمہ جناح بھی تھیں۔

قوم کو حوصلہ دیتی ہوئی آنکھوں کی چمک
جبِ تاریخ کو للکارتی ماتھے کی شکن
بھائی کی طرح وہ گفتار میں کردار کی شان
وہی لہجہ، وہی آواز، وہی طرزِ سخن

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص126)

اُن کی شاعری میں عقیدت و احترام کا تحسین کی صورت میں اظہار صرف قومی ہیروز تک ہی محدود نہیں بلکہ اور بھی کئی بزرگ ہستیاں ہیں جن کی شان میں انھوں نے خوب صورت نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں محدود زاویے سے اسلم انصاری کی اُن ہستیوں سے عقیدت اور محبت کا شعری ثبوت ہیں اور وسیع زاویے سے دیکھا جائے تو انھی نظموں میں مُحبِ وطن شاعر کی اپنی مٹی کے ساتھ محبت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم "حضرت خواجہ غلام فریدؒ" اس حوالے سے ایک بہت اہم نظم ہے۔ اس میں اسلم انصاری نے خواجہ فریدؒ مٹھن کوٹی کا تذکرہ عقیدت و محبت کے بلند ترین جذبات میں ڈوب کر کیا ہے۔ نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

بہ فیضِ خواجہؒ سئیں انبساطِ دل ہے نصیب
بہ سوئے کوٹ مٹھن رہ نما ہے شوقِ مزید

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص93)

احمد ندیم قاسمی ایک معروف ادیب، شاعر، افسانہ نگار، صحافی، مدیر اور کالم نگار تھے۔ انھوں نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ افسانے اور غزل کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اسلم انصاری، قاسمی صاحب کی شخصیت کے زبر دست

مداح اور اُن کے فن کے حد درجہ معترف ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ قاسمی صاحب کا تہہ دل سے احترام کیا اور اُن کی نگاہِ استحسان کو اپنے لیے باعثِ اعزاز سمجھا۔ "خواب و آگہی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ان سطورِ پریشاں کے اختتام پر مجھے اپنے مُحترم بزرگ جناب احمد ندیم قاسمی کے لیے اپنے تشکرات کا اظہار کرنا ہے، جن کی بے پایاں مُحبّت نے زندگی کی مثبت اقدار پر میرے یقین کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے ہمیشہ میری تخلیقی پیش رفت کو دلچسپی سے اور میری کاوشوں کو نگاہِ استحسان سے دیکھا۔(17)

لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ اسلم انصاری اپنی محترم اور پسندیدہ شخصیت کو نظمیہ انداز میں نذرانۂ عقیدت پیش نہ کرتے۔ "شبِ عشق کا ستارہ" کی دو نظمیں احمد ندیم قاسمی کی یاد میں لکھی گئیں۔ "وہ ایک شخص کہ تھا اہتزازِ شعلۂ گُل" سات بندوں پر مشتمل ایک پابند نظم ہے۔ شعلۂ گُل، جلال و جمال، محیط، دشتِ وفا اور بسیط، احمد ندیم قاسمی کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ دیکھیں انہی ناموں کو اسلم انصاری نے کتنے کمال کے ساتھ موصوف کی صفاتِ خاص سے ملایا ہے۔

وہ ایک شخص کہ تھا اہتزازِ شعلۂ گُل
اُس ایک شخص میں تھے مجتمع جلال و جمال
اُس اِک شراغ سے کتنے چراغ جلتے گئے
بہ لوحِ خاک سنورتا گیا ہنر کا مآل

وہ طرزِ خاص کا حامل، وہ صاحبِ اُسلوب
بہ اعتبارِ سُخن علامِ ہنر پہ محیط
بہ اقتضائے جنوں رہ نوردِ دشتِ وفا
بہ اختیارِ خرد جلوۂ شعورِ بسیط
(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص127۔128)

نظم کے آخری بند پر تو گویا قلم ہی بند کر دیتے ہیں:

سخن وری میں یگانہ، وہ نظم ہو کہ غزل
نگارِ فن کا پرستار تھا مدیرِ شہیر

وہ کوئی حرفِ مکرر نہ تھا کہ مٹ جاتا
زمانہ لا نہ سکے گا سخن میں اُس کی نظیر

(شبِ عشق کا
ستارہ۔ ص129)

بائیس مصرعوں پر مشتمل نظم "درخشاں چاہیے باطن" آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں اسلم انصاری نے احمد ندیم قاسمی کے گوشۂ عُزلت میں بیٹھ کر کام کرنے کا آنکھوں دیکھا حال نہایت خوب صورت انداز میں سنایا ہے۔ مثلاً نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

خروشِ بے امانِ شہر سے بچ کر
مَیں جب اُس کنجِ خلوت میں پہنچتا تھا
جو اپنے آپ میں چھوٹی سی دنیا تھی محبت کی
تو اُس کو دیکھتا تھا، مسکراتا، کام کرتا،
کام میں مصروف، لیکن بات کرنے کے لیے تیّار بھی

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص142)

احمد ندیم قاسمی کبھی نہ تھکنے والے ادیب تھے۔ انھوں نے پچاس سے زائد شعری اور نثری کتابیں تخلیق کیں۔ "نقوش"، "ادبِ لطیف"، "سویرا"، "صحیفہ" اور "اقبال" جیسے اردو کے مؤقر ادبی جریدوں کی ادرات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کئی اخبارات سے بحیثیت مدیر اور کالم نگار وابستہ رہے۔ 1963ء میں اپنا رسالہ "فنون" جاری کیا اور تا عمر اِس کی ادارت کرتے رہے۔ اسلم انصاری کہتے ہیں کہ اس قدر مسلسل محنت و مشقت کے لیے انسان کا باطن روشن اور صاف ہونا چاہیے۔

کبھی جب جھلملا جاتی تھی شمعِ ضوفشاں اُس کی
تو پھر بھی رُک نہ پاتی تھی طلاقت میں زباں اُس کی
تامّل خیز لمحوں میں بھی جیسے رزمیہ اُس کا
عبورِ سطر و کاغذ میں کبھی تھکتا نہ تھا پَل چھن
مگر اس کے لئے یارو
درخشاں چاہیے باطن

(شبِ عشق کا ستارہ۔ ص143)

نظم کے درج بالا تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی محبت ایک دائرے کی حد تک محدود نہیں بلکہ مختلف دائروں میں گھومتی ہے۔ پہلے دائرے کو شخصی محبت کا دائرہ کہا جا سکتا ہے جب کہ دوسرا حب الوطنی کا دائرہ ہے۔ تیسرے دائرے کے طور پر اُن کی وہ عقیدت و محبت سامنے آتی ہے، جو انہیں اپنے بزرگوں سے تھی۔ تیسرے دائرے کو دوسرے دائرے کی عملی صورت کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان تمام دائروں میں گھومتی محبت میں جذبے کی سچائی اور احساس کی شدت محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہی سچائی اور شدت اُن کی نظم میں جدت اور انفرادیت پیدا کرتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، خواب و آگہی، ملتان: کاروانِ ادب، 1982ء، ص18

2۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، نقش عہدِ وصال کا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 1996ء، ص16

3۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، شبِ عشق کا ستارہ، ملتان: کتاب نگر حسن آرکیڈ، 2009ء، ص16

4۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، خواب و آگہی، ایضاً، ص17

5۔ ایضاً، ص16

6۔ جاوید اصغر، ڈاکٹر، گفتگو کا چراغ (اسلم انصاری۔ شخصیت اور فن)، لاہور: فکشن ہاؤس، 2002ء، ص58

7۔ افتخار شفیع، ڈاکٹر، ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2010ء، ص59

8۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، تکلمات (ادبی، فکری اور تہذیبی کالم)، لاہور: فکشن ہاؤس، 2000ء، ص22

9۔ ایضاً، ص25

10۔ جاوید اصغر، ڈاکٹر، گفتگو کا چراغ (اسلم انصاری۔ شخصیت اور فن)، ایضاً، ص59

11۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، تکلمات (ادبی، فکری اور تہذیبی کالم)، ایضاً، ص122

12۔ عبد الرؤف، اسلم انصاری بحیثیت شاعر، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، 2004ء، ص55

13۔ جاوید اصغر، ڈاکٹر، گفتگو کا چراغ (اسلم انصاری۔ شخصیت اور فن)، ایضاً، ص60

14۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، نقش عہدِ وصال کا، ایضاً، ص102

15۔ افتخار شفیع، ڈاکٹر، ڈاکٹر اسلم انصاری: شخصیت اور فن، ایضاً، ص92

16۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، تکلمات (ادبی، فکری اور تہذیبی کالم)، ایضاً، ص120

17۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، خواب و آگہی، ایضاً، ص19